۱۹۷۰ کی منتخب شاعری

مرتبین

کمار پاشی - پریم گوپال متل

۱۹۷۰ء کی منتخب شاعری

۱۹۷۰ء
کی منتخب شاعری

ترتیب:
کمار پاشی
پریم گوپال متّل

ناشر
پی۔کے۔ پبلیکیشنز، ۱۷۱۵، آریہ سماج روڈ، قرول باغ، نئی دہلی ۵

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

بار اوّل : جنوری ۱۹۷۱ء

زیرِ اہتمام : کے. جی. متّل

مطبع : یونین پرنٹنگ پریس، دہلی ۶

قیمت : تین روپے

نظمیں

ن۔م۔ راشد

مجید امجد

منیب الرحمٰن

وزیر آغا

باقر مہدی

کرشن موہن

سلیمان اریب

بلراج کومل

مخمور سعیدی

قاضی سلیم

بشر نواز

ندا فاضلی

عمیق حنفی

شہریار

جیلانی کامران

عادل منصوری

صادق

نثار ناسک

ظہیر صدیقی

کرشن مراری

زاہدہ زیدی

حمید سہروردی

حمیدہ فاروق

مصحف اقبال توصیفی

سرور کامران

سیّد حبیب

وہاب دانش

عباس اطہر

کمار پاشی

غزلیں

احمد ندیم قاسمی
گوپال متل
خورشید احمد جامی
بل کرشن اشک
شہزاد احمد
شاذ تمکنت
حسن نعیم
بشیر بدر
محمد علوی
خلیل الرحمٰن اعظمی
من موہن تلخ
بانی
زبیر رضوی
نشتر خانقاہی
راج نرائن راز

مظہر امام
ممتاز راشد
مسعود سبزواری
سلطان اختر
ناصر شہزاد
کرامت علی کرامت
پرکاش فکری
نازش انصاری
شمیم حنفی
آزاد گلاٹی
قمر اقبال
عروج زیدی
ارشد بجنوری

غلام مرتضیٰ راہی
مدحت الاختر
چندر پرکاش شاد
اسلم آزاد
احتشام اختر
زیب غوری
عقیل شاداب
حسن کمال
عبدالرحیم نشتر
شاہد ماہلی
احمد وصی

باتیں

یہ چوتھا اور اس دہائی کا آخری سالانہ شعری انتخاب ہے۔ اس دہائی میں ایوانِ شعر میں جو مختلف اور منفرد آوازیں سنائی دی ہیں، ان سے ایک ایسی خوشگوار فضا تخلیق ہوئی ہے جس سے مستقبل کی اردو شاعری کی سمت و رفتار کا تعین کرنا قدرے آسان ہو گیا ہے۔

بیانیہ طرزِ اظہار سے دور، سرگوشی یا خود کلامی کے سے لہجے والی، معنویت کے اعتبار سے زیادہ گہری اور وسیع، داخلی اور کسی حد تک نجی تجربات و مسائل سے رنگی اور مروجہ شعری تلازمات کے حصار سے آزاد یہ شاعری ایک نئے شعری وفنی ضابطے کی تشکیل کا احساس کراتی ہے۔ یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ یہ شاعری ہمارے پرانے شعری سرمایے کی نفی نہیں کرتی بلکہ نئی فضائیں اپنے وجود کا اثبات چاہتی ہے۔

بعض ناقدوں نے اس دہائی کی اردو شاعری کے گرد مایوسی، مرگ پرستی اور تنہائی جیسے موضوعات کا حصار کھینچنے کی جو کوشش کی ہے اور جس کے نتیجے میں جدید شاعری پر وقتاً فوقتاً عجیب و غریب الزامات عاید ہوتے رہے ہیں، پچھلے انتخابات کی طرح زیرِ نظر شعری انتخاب بھی اس کی نفی کے لیے کافی ہے۔ اس انتخاب میں آپ کو اس دہائی کی شاعری کے وہ تمام خوشگوار رنگ نظر آئیں گے جو اپنی انفرادی پہچان رکھتے ہیں اور جنھیں کسی یک سنگی نظریاتی حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

دہلی۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۰ء

(مرتبین)

ہم ان شاعروں کا جن کی تخلیقات اس مجموعے
میں شامل ہیں اور ان تمام مدیران کا جن کے
رسائل سے یہ تخلیقات نقل کی گئی ہیں، تہِ دل
سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

نظمیں

اے غزالِ شب
ترمی پیاس کیسے بجھاؤں میں
کہ دکھاؤں میں وہ سراب جو مری جاں میں ہے
وہ سراب ساحرِ خوف ہے
جو سحر سے شام کے رہ گزر
میں فریبِ راہروِ سادہ ہے
وہ سراب زادہ، سراب گر، کہ ہزار صورتِ نو بہ نو
میں قدم قدم پہ ستادہ ہے
وہ جو غالب و ہمہ گیر دشتِ گماں میں ہے
مرے دل میں جیسے یقین بن کے سما گیا
مرے ہست و بود پہ چھا گیا

اے غزالِ شب
اسی فتنہ کار سے چھپ گئے
مرے دیرو زود بھی خواب میں

مرے نزد و دور حجاب میں
وہ حجاب کیسے اٹھاؤں میں جو کشیدہ قالبِ دل میں ہے
کہ میں دیکھ پاؤں درونِ جاں
جہاں خوف و غم کا نشاں نہیں
جہاں یہ سرابِ رواں نہیں
اے غزالِ شب !

—— سطور (دہلی)

مجید امجد

غریب

ننھی، بھولی، میلے میلے گاؤں والی، بے مدھ سی اک بچی
تیری جانب دیکھ رہی ہے، دیکھ اس کی آنکھیں تیری توجہ کی پیاسی ہیں

اس کی نازک بے حس ٹھوڑی کو اپنی انگلی کی سنہری پور سے مس تو کر، — اور
اس سے اتنا تو پوچھ "اچھی بلّو، تو کیوں چپ ہے"
اور جب وہ منہ پھیر کے اپنی آنکھیں اپنے ہی چہرے پہ جھکا لے۔
تو ہی بڑھ کر اس کے ماتھے کو اپنے ہونٹوں سے لگا لے۔ ہاں، ایسے ہی!

کیوں — اس جھنجھلو نے تجھ سے کہا کیا۔
یہ کیا — تیری آنکھیں بھیگ گئیں کیوں۔
اس نے تجھ سے کہا کیا، ساتوں آسمانوں کے مالک،
اتنے پتلے دل والے مالک، — ہم بھی روز اس چہرے کی کتھا سنتے ہیں
ہم تو کڑا کر لیتے ہیں جی، ایسے موقعوں پر .....

— کتاب (لکھنؤ)

منیب الرحمٰن

اجنتا

چٹانیں بول سکتی ہیں
چٹانیں راز اپنے کھول سکتی ہیں
دکھا سکتی ہیں یہ تقدیس کی دنیائے ناپیدا
جہاں فکر و فنِ عزلت نشیں کی خانقاہیں ہیں
جہاں احساس کی گہری گپھائیں ہیں

وہ کس کی انگلیاں تھیں جن کے لمسِ سحر آگیں نے
انھیں اذنِ سخن بخشا
وہ کس کی گرمیِ دل تھی کہ جس نے ان کو تن بخشا
یہاں ہر شخص آئے گا
مگر اس کو نہ پائے گا
اسے ڈھونڈو وہ شاید ان چٹانوں میں چھپا ہوگا
یہ پہلی شرط تھی ان کے تکلم کی
کہ جو بھی ان کے اسرارِ مقفل ڈھونڈنے آئے
وہ خود ان میں سما جائے

وزیر آغا

ڈھلوان

ایک ننگی چیختی آواز
پھر چابک کا شور
کھڑکھڑاتے زنگ آلودہ سے پہیوں کی صدا
اور میں آواز کے آگے جُتا !
میری آنکھوں پر نقاب
میرے منہ میں خاردار آہن کی جیب
میرے بازو
سخت چمڑے کے سیہ رسّوں کے
برہم جال میں جکڑے ہوئے
اور میرے سُم
مرے چاروں رفیق
گھاٹیوں سے، پتھروں سے بے خطر
خندقوں سے بے نیاز !

آہنگ (گیا)

باقر مہدی

ایک لمبی گونج

پورب دیس سے پھر اٹھی
چیخ کی لمبی گونج
قطرے بن کر برس پڑے
ٹوٹے ٹوٹے، بسمل لفظ
کانوں میں نقارے باجے
رگ رگ میں چنگاری دوڑی
دبی دبی ساری آہیں
ٹھنڈے سینوں میں ابھریں
سوکھے ہونٹوں سے نکلیں
بجھی بجھی سی آنکھوں میں
دیکھ! امنگوں کی بجلی
تڑپ تڑپ کے چمکے بجلی!
لہر لہر ٹکرائے
طوفانوں کو جگائے
سنو سنو!!
اُس پار افق کے
چیخ کی لمبی گونج!

سطور (دہلی)

کرشن موہن

آوارہ ـــــ سڑکوں پر گھومیں
ہیٹنگ اور بیٹل اور ہپّی
"تحریکِ گل" ـــــ کھل جا اور کھُل
چہک ذرا اور اُڑ جا بُلبُل
سرگوشی کر، بہہ جا قلقُل

جوبن کی ندّی پہ بنا لے بنجارہ رنگت کی دُکھ سُکھ سنگت کا پُل
جسم ہے جامِ مُل، روح و دل کھول کے اس میں گھول، اس میں گھُل
جیون ہے جُل تو بھی جیون کو دے جا جُل
ناچیں، گائیں، بہکیں، جھومیں
جب جی چاہے ہم بستر ہوں
جب جی چاہے، چاٹیں چومیں
مجلس اور مچائیں دھومیں
پھول ببول کہ دھول بنیں ہم
جنم مرن کی شہراہوں پر غول بنیں ہم
ہاتھ میں لے ترشول مہیش بنیں، درویش بنیں کہ رسول بنیں ہم

روز و شب نشے میں جھولیں
مستی کا ہر رنگ قبولیں
اپنی پھلتی نسل کی آزادی پر پھولیں
دھرتی کے ہر سنجیدہ اقدام کو بھولیں
"کام" رچائیں، کام کو بھولیں

... ...

ڈھیلی چولیں
پھر بھی دل میں حسرت ہے، مریخ کو چھولیں

—— تحریک (دہلی)

سلیمان اریب

میرا کمرہ

یہ غالبؔ ہیں
یہ ہیں اقبالؔ
یہ بدھا
یہ عیسیٰ ہیں
یہ کیلنڈر میں بیٹھی
ایک ہندستانی دوشیزہ ہے
جس کی نیم عریاں چھاتیاں
ہیں ماہتابِ واژگوں گویا
مگر ان پانچ چہروں، پیکروں نے کیا بناڈالا ہے
میرے سادہ کمرے کو
ایک ایسی پینٹنگ جس میں
خدا ترغیبِ جنسی دے رہا ہو
جیسے خود اپنے ہی بندوں کو

(سطور (دہلی)

بلراج کومل

زرد لڑکی کا چہرہ

منجمد خون جب سُرخ سے کل سیہ ہو گیا
خاکِ پا واقعہ ہو گیا
زرد لڑکی کا چہرہ فرشتوں نے دیکھا تھا
رنگوں کی ترتیب میں
جانے پہچانے چہروں سے میری ملاقات جب اجنبی سی لگی
آئنہ دیکھنے کے لیے میں اٹھا، آئنہ ہو گیا
تیرگی سے گذرتی ہوئی روشنی برگِ اسرار تھی
آنکھ کے سامنے روشنی خون تھی
خون پہلے گرا، منجمد ہو گیا، پھر سیہ ہو گیا
زرد لڑکی کا چہرہ
گذرتا ہوا برگِ اسرار تھا
رہ گزر سے لپک کر مکاں میں گیا
پھر دریچے میں اُبھرا
فرشتوں نے دیکھا تھا
میں نے بھی دیکھا تھا
میں بھی فرشتہ تھا ؟

کل کے فسانے کی ترتیب میں لفظ مجھ سے جُدا تھے
مگر آج میرے ہیں، کیوں آج بھی اجنبی ہو گئے، ان کو کیا ہو گیا؟
ان کو کیا ہو گیا؟

منجمد خون پہلے سیہ ہو گیا
پھر فقط واقعہ تھا،
مگر زرد لڑکی کا چہرہ عجب نقش تھا
میں مٹاتا تھا لیکن وہ مٹتا نہ تھا
دید کا حادثہ پہلے منظر بنا
پھر فقط ایک منظر سے بیکار سا سلسلہ ہو گیا
زرد لڑکی کا چہرہ خدا سے بڑا خواب تھا۔

——— سطور (دہلی)

مخمور سعیدی

وہ شہر اب بھی اسی جگہ ہے

وہ شہر اب بھی اسی جگہ ہے
وہ سرد ریتیلے راستے ۔۔۔
آج بھی انہی وادیوں کی جانب رواں دواں ہیں
جہاں گھنے جھنڈ ہیں درختوں کے،
شاخساروں میں چہچہاتے ہوئے پرندوں کی ٹولیاں ہیں
جہاں پہاڑوں کی سرمئی چوٹیوں پر آوارہ بادلوں نے
نشیمن اپنے بنا رکھے ہیں
ندی کے پانی میں ۔۔۔
سبز پرچھائیوں کی پریوں کا ہے بسیرا
شریر جھونکے ہوا کے جن کا سجل بدن گدگدا رہے ہیں
فضا میں وہ تازگی و تابندگی جہاں مسکرا رہی ہے
ہُوا ہو صدیوں کے بعد جیسے زمیں پہ پہلے پہل سویرا
کیا ہو سورج نے جیسے صدیوں کے بعد اس خاکداں کا پھیرا

وہ شہر اب بھی اسی جگہ ہے
وہ سارے منظر ابھی انہی چوکھٹوں میں جیسے جڑے ہوئے ہیں

گئے زمانے بھی جیسے آنکھوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں
وہی گلابی سی دھوپ دیوار و در کو رنگیں بنا رہی ہے
کھلی چھتوں پر....
وہی رو پہلی سی چاندنی گیت گا رہی ہے
کشادہ دل آنگنوں میں اب بھی
نشاطِ احساس کے شگوفے چٹک رہے ہیں
کہیں سجی ہے خود اپنے ہی سائباں کے نیچے
قرارِ قلب و نظر کی محفل
کہیں پڑوسی کے گھر کا نغمہ ــ سکوں کی سوغات بانٹتا ہے
کہیں جھروکوں سے جھانکتا ہے کسی کا پندارِ خود نمائی
کہیں منڈیریں پھلانگتا ہے کسی کا احساسِ نارسائی
وہی جھروکے، وہی منڈیریں، بلند و بالا وہی منارے
اور ان مناروں پہ پر سکھاتے
کبوترانِ حرم وہی ہیں
اذاں کی آواز سن کے مسجد کی سمت اٹھتے قدم وہی ہیں
ابھی وہی آسمان ان کی زمیں پہ سایہ کیے ہوئے ہے
ابھی وہاں اپنے نیک بندوں کی قسمتوں کی
خدا ضمانت لیے ہوئے ہے

وہ شہر اب بھی اسی جگہ ہے
وہ لوگ اب بھی اسی طرح ——
ایک دوسرے کے غموں سے واقف —— مسرّتوں سے بھی باخبر ہیں
وہ آشنا منزلوں کے راہی ہیں ——
جادۂ روز و شب پہ صدیوں سے ہمسفر ہیں
وہ جانتے ہیں
کہ اس شب و روز کی مسافت کا مدّعا کیا، مآل کیا ہے
وہ جانتے ہیں
کہ کون کس مرحلے پہ کیا سوچتا ہے،
کس کا خیال کیا ہے!
وہ خود کو پہچانتے ہیں،
اپنی حدوں کو بھی جانتے ہیں،
اپنی حدوں میں رہ کر ہی جی رہے ہیں
جنم جنم سے سکھی رہے ہیں

کبھی وہ مجھ سے بھی آشنا تھے، مجھے بھی پہچانتے تھے لیکن
میں ایک لمبے سفر پہ نکلا ....
(دہکتی لوہے کی پٹریاں میرے آگے پیچھے رہیں لپکتی بہت دنوں تک)
اور آج برسوں کے بعد لوٹا تو میں نے دیکھا

میں وہ نہیں ہوں
جسے وہ سب الوداع کہتے ہوئے کسی روز رو پڑے تھے
میں وہ نہیں ہوں
جو اُن سے رخصت کے وقت شاید اداس بھی تھا ملول بھی تھا
میں ان سے کہتا ہوں : میں وہی ہوں
تو میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگتی ہے،
جیسے کہتا ہو کوئی : تم جھوٹ بولتے ہو
(تو کیا یہ سچ ہے کہ دوزخی مجھ میں آ گئی ہے ؟!)

وہ شہر اب بھی اسی جگہ ہے
وہ سرد ریتیلے راستے ــــ
آج بھی انہی وادیوں کی جانب رواں دواں ہیں
وہ سارے منظر ابھی انہی چوکھٹوں میں جیسے جڑے ہوئے ہیں
وہ لوگ اب بھی اسی طرح ــــ
ایک دوسرے کے غموں سے واقف،
مسرّتوں سے بھی باخبر ہیں
مگر اب ان میں مجھے کوئی جانتا نہیں ہے
میں دُور کا، اجنبی مسافر نہیں، کوئی مانتا نہیں ہے

ــــــــ ایشیا (دہلی)

قاضی سلیم

کہو ــــ کچھ تو کہو
(نذرِ گجرات)

کہو شاید ہمارے گوشت کے اندر
لہو کے برقیوں میں
اور دھکتی دھمنیوں میں
ــــ آنکھ بن کر اب بھی کوئی جاگتا ہے
وہی سچائیوں کی قبر کا آسیب
اندھے آئنوں کے عکس کا کوندا
'ہمیشہ' کے سمندر، کا بلاوا
موت کی سانسوں کا لہرا
بھیک کا کاسہ
کچھ ایسا جس کی شاید اک چھُون سے
ہماری خودکشی قربانیوں کا نام پاتی ہے

کہو ــــ جو کچھ بھی ہے
ــــ جیسا بھی ہے
وہ آج زندہ ہے
کہو ــــ کچھ تو کہو وہ جھوٹ ہی پھر آج دُہراؤ۔

ــــ شعر و حکمت (حیدرآباد)

بشر نواز

آنے والے مصنفین کے نام

ایک رقعہ لکھیں
اور یوں لکھیں
ہم تو اپنے دور کی بے رنگیوں، بدعہدیوں اور نفرتوں کی
مردہ تفصیلات کی زندہ کہانی اپنے خوں سے لکھ گئے

ہم کیا کریں / گر اپنا خوں
کالے بدبودار قاتل زہر ہی کی لہر تھا
اور یہ لکھیں / ہمارے دور میں
سات رنگوں کی دھنک
کالے کمبل اوڑھتی تھی
اُجلے اُجلے چاولوں میں سنگ ریزوں کی بڑی بہتات تھی
اور ہمارے پیرہن / آگ سے کترے گئے تھے
اور جو تھا کھال کے اندر پگھل کر بہہ گیا تھا
اور لکھیں یہ بھی، کہ ہم تو اپنا حصہ پا چکے
اب تمھارے واسطے
سات رنگوں کی برہنہ قوس ہے
اس کو اپنے طور پر / جب کبھی ترتیب دینا خون کے اک رنگ کو / ــــ

—— / چھوڑ دینا ان کے نام
جن کی رگ رگ کالے بدبودار قاتل زہر سے بیزار تھی
پھر بھی اسے ڈھونے پہ جو مجبور تھے

جن کو اپنے جسم میں / جیسے لہو کی سرخ دھار
دیکھنے کا عمر بھر ارماں رہا / اور جو اپنے دور کی بے رنگیوں .....
... کی مردہ تفصیلات کی زندہ گواہی دیتے دیتے سو گئے ،

—— سطور (دہلی)

ندا فاضلی

پہچان

نہیں !!!
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
وہ تو !!
نہ جانے کون تھے ؟
یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں
سبھی کی دھڑکنوں میں
ننھّے ننھّے چاند روشن ہیں
سبھی میری طرح سے
وقت کی بھٹّی کے ایندھن ہیں

جنھوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھُس کر
مری آنکھوں کے آگے
میرے بچّوں کو جلایا تھا

وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ نج صاحب !
مگر ہاں پاس ہوں تو
سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اُس جنگل سے آئے تھے
جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے ....!

——— شاعر (بمبئی)

عمیق حنفی

آئینہ پیشِ آئینہ

اپنے وجدان کے برگد کے گھنے پیڑ تلے
ایک پل موند کے آنکھیں جو سمیٹا خود کو
دامنِ وقت کی مانند وہ پل پھیل گیا
جسم اور جان، زماں اور مکاں ایک ہوئے
خود چمکنے لگا تاریک حجاب
سات رنگوں میں وہ تاریکی بٹی
اور ان رنگوں کے دریاؤں سے
زہرہ، ناہید، ثریّا کے مزامیر کا نغمہ اٹھا
بے کراں نور میں گھل مل گئے ساتوں دریا
تیزی ایسی کہ ہزاروں خورشید
ٹھنڈک ایسی کہ ہزاروں مہتاب
بے کراں نور کی تہ میں جب اتر کر کھلیں میری آنکھیں
تیرے آغوش میں رکھے ہوئے میں سر نظر آیا خود کو
بے کراں نور تری آنکھوں میں پایا میں نے
اور اس نور کی تہ میں خود کو.....

(سطور دہلی)

سمیٹو ان بکھرتی ساعتوں کو
بند مٹھی کھول کر آزاد کر دو
ساری سمتوں کو
نگاہوں کی حدوں سے سب مناظر ہٹتے جاتے ہیں
سرابوں کے سمندر کے کنارے کٹتے جاتے ہیں
سرابوں کے سمندر کے مسافر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹتے جاتے ہیں
ہوا کے ہونٹ ان الفاظ کو دہراتے جاتے ہیں
"سمیٹو ان بکھرتی ساعتوں کو
بند مٹھی کھول کر آزاد کر دو
ساری سمتوں کو"

——— شب خون (الہ آباد)

جیلانی کامران

ہمارے مکانوں کے اوپر سے کونجیں
جنوبی علاقے سے آتی ہوئی ، چاندتارا بناتی ہوئی
آج گزریں گی ، ان کے گزرنے ،
مسافت میں رُوپوش ہونے سے ہم جان لیں گے
کڑاکے کی سردی گئی ہے بہار آ رہی ہے

یونہی گود ماں کی ، لڑکپن ، جوانی ، بڑھاپا . . . .
بہار آ رہی ہے
اُنہی رُخ بدلتے ہوئے ، راہ جاتے ہوئے قافلوں کو
کوئی میری جانب سے اتنا کہے
آنے جانے کے پھیلے ہوئے قافلے پر
کہاں سرد موسم رُکے گا
کہاں کس طرح سے بہار آئے گی
سبزہ کن راستوں پر اُگے گا ؟

جوانی ، بڑھاپا ، لڑکپن زمیں اور ماں . . . . .
رفت کے بعد آمد کہاں ہے ؟

—— آہنگ (گیا)

عادل منصوری

شکستہ سورج

شکستہ سورج کے سارے ٹکڑوں کو
کچّے دھاگے سے باندھتا ہوں
رگوں میں پٹرول پھیلتا ہے تو
خالی جیبوں سے چاند تارے نکالتا ہوں
افق کی گردن پہ پاؤں رکھ کر
میں جب بھی سرحد پھلانگتا ہوں
ہزاروں ناخن
خلا میں مجھ کو دبوچتے ہیں
ہزاروں ناخن
اُتار لیتے ہیں کھال میری
ہزاروں ناخن
مری رگوں میں گرہ لگا کر
اسی سے سورج کے سارے ٹکڑوں کو باندھتے ہیں
ہزاروں ناخن
مرے بدن کی شکستہ سرحد پھلانگتے ہیں

(سطور دہلی)

صادق

ایک پرانی نظم

کچھ نہیں جانتا
کس طرح آگیا
میں ہوا کے بھیانک علسمات میں
کوکھ سے جس کی تولید پاتے ہیں بالشتیے
روز و شب، ہر گھڑی
مجھ میں در آتے ہیں، بے اجازت
کھلی دیکھ کر کھڑکیاں — اور در

موت اور زندگی ان کا اک کھیل ہے
کیونکہ ہر ایک بالشتیہ
موت سے قبل، جاں سونپ جاتا ہے اپنے کسی جانشیں (دوسرے) کو
دوسرا، تیسرے
اور پھر، تیسرا چوتھے بالشتیے کو۔
اس طرح مرتے۔ جیتے نراکار بالشتیوں اور ان کے طلسمات کا سلسلہ
جنم سے آج تک سوچتا آ رہا ہوں

کتنا مجبور ہوں، چاہتا ہوں
مگر ان طلسمات کا انت، میں دیکھ سکتا نہیں
..... اور اَن دیکھے بھی ان کا سِرِّ خفی مجھ کو معلوم ہے

ان طلسمات کا ایک قیدی ہوں میں
ان سے بچھڑا تو لاریب مر جاؤں گا
یہ جو بکھرے تو میں خود بکھر جاؤں گا
..... اور پھر اپنا منہ کھول کر، مجھ کو سالم نگل جائے گی
ایک ڈائن ـــــ (زمیں)

ـــــــ کتاب (لکھنؤ)

نثار ناسک

عطائے رائیگاں

مرے سینے کو اپنی جگمگاتی انگلیوں سے چیرنے والے
تو مجھ پر میرے آنے والے دن کو بے جہت کر دے
کہ میں نے جس قدر جانا ہے
اُتنے دکھ اٹھائے ہیں
مرے اندر مرے سارے سفر کا
بے نوا بیکار پن
آتش فشاں لاوے کی صورت سانس لیتا ہے
کہ جیسے بند جوہڑ کے کھڑے پانی میں کیڑے کلبلاتے ہیں
تعفن ـــ ان گنت لفظوں کی لاشوں پر بچھے
کالے کفن کا ماتمی لمحہ ـــ
میں تیرے علم کی بخشی ہوئی مجبوریوں کے حبس میں
اپنی گواہی نظم کرتا ہوں
نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں
مرے سینے کو آ کر کھول
اپنا علم اپنا نور مجھ سے چھین لے
لیکن مجھے پھر سے مری حیرانیاں دے دے!

ـــــ تحریک (دہلی)

ظہیر صدیقی

نہ لذّتوں کا بحر تھا
نہ خواہشوں کی وادیاں
نہ دائرے ثواب کے
نہ زاویے عذاب کے
بس ایک روشنی اسیرِ ذات تھی ـــ محیطِ کائنات تھی
ازل سے بے لباس تھی

تو یوں ہوا کہ دفعتاً
مرے بدن کے پیرہن میں چھپ گئی
تو لذّتوں کا بحر موج زن ہوا
تو خواہشوں کی وادیاں سلگ گئیں
تو دائرے ثواب کے پھسل گئے
تو زاویے عذاب کے مچل گئے

عجیب واقعہ نہیں
مرے بدن کا پیرہن تو لذّتوں کے تار میں بُنا گیا
وہ خواہشوں کے بحر میں

جو موج موج بہہ گیا
تو کیا ہوا
یہ راز راز رہ گیا کہ خواہشوں سے بے نیاز روشنی
(جو قبل ارتکاب ہی
مرے بدن کے پیرہن میں جانشیں تھی)
سدِ ارتکاب کیوں ہوئی نہیں
نہیں ؟
تو پھر
سزا میں وہ شریک کیوں ہوئی نہیں

——— کتاب (لکھنؤ)

کرشن مراری

نظم

میں نے اک انجان نگر میں
ایک مکاں پر دستک دی ہے
مجھ کو یہ آشا تھی کوئی فرشتہ سیرت
اپنی بصیرت، اپنے نورِ دل سے میرا رہبر ہوگا
لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں
سناٹے کا بھوت کھڑا ہے
بے حس وحشت کا اک پیکر
"زہر آمیز ہنسی ہنستا ہے"

تحریک (دہلی)

زاہدہ زیدی

جنگل

زیست کی تنگ پیچیدہ راہوں پہ
چلتے ہوئے
ایسے پُر ہول جنگل میں ہم کس طرح آ گئے
سخت سوکھی زمیں پر
درختوں کے بوجھل تنے
تند خو اور وحشی درندوں کی مانند
پنجے جمائے کھڑے ہیں
ان کی سوکھی ہوئی زرد شاخوں
انسانوں کے ہاتھ پاؤں
کٹے سر
کٹے جسم
بازو
بازوؤں اور ٹانگوں سے محروم دھڑ
ناک نقشے سے محروم چہرے
ہر اک سمت لٹکے ہوئے ہیں

راستے منتشر
پُرخطر راستے
ایک مبہم اندھیرے میں گم ہیں
اور ان راستوں میں
کئی انگلیاں
کان
الجھے ہوئے بال
ویران آنکھیں
چھدے ہونٹ
ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں

زخم خوردہ تھکتے قدم
خود بخود رک گئے ہیں

کوئی انسان مجھ کو مل گر
تو پوچھوں: کہ کیا میں ابھی تک
وہی شعلہ اندام سیماب پا
ذوقِ ہستی سے بے تاب درد آشنا
ایک انسان ہوں
یا فقط کوئی ٹوٹا ہوا ہاتھ،
بازو،
کوئی ناک نقشے سے محروم چہرہ ہوں میں
اور یوں
سخت شاخوں سے لٹکی ہوئی ہوں

کوئی سرشار جذبوں کی جوئے رواں ہو
تو دیکھوں
کہ کیا میری آنکھوں کی گہرائیوں میں
ابھی تک وہی جرأتِ دید ہے

رفعتِ ذوقِ پرواز ہے
اور کیا میرے اعضا کے خم
اور میرے خدوخال ابھی
زندگی کی صراحت کے غمّاز ہیں
لذتِ آگہی کے امیں ہیں
یا کہ اب میں بھی بس
کچھ کٹے کان
ویران آنکھیں
چھدے ہونٹ
بکھرے ہوئے بال ہوں
اور یوں
نیم تاریک گم نام راہوں میں
بکھری ہوئی ہوں

——— شب خون (الہ آباد)

سچ مانو: میں نے تمھیں دیکھا نہیں
یونہی خیال بن کے تم میری آنکھوں میں بسے ہو
سچ مانو میں نے تمھیں ہرگز دیکھا نہیں
ایک مرتبہ یوں ہوا تھا
کہ مایوس لمحوں میں تمھیں آواز دیکر، اپنی طرف متوجہ کرنے کی سعی کر ہی رہا تھا
کہ آہستہ سے آواز آئی
وہ نہیں ہے یہاں، پہاڑوں کی دنیا میں اپنے سفر پر جا چکا ہے
اب وہ یہاں نہیں ہے
صرف اپنی پرچھائیں کی آسودگی کو چھوڑے
کسی انجان جزیرے کی کھوج میں نکل چکا ہے
پھر وہ کہیں سے زخمی ہو کر، تمھارے پاس آئے گا
اور اپنی آواز یوں بلند کرے گا
کیا تم نے مجھے پکارا؟
تم کہنا ہرگز نہیں
مری عبادت کسی بھی کھوج کے لیے نہیں ہے
میں محسوس کرتا ہوں اکثر اوقات

کہ مایوس لمحے، پژمردہ سے ہو کر
خوبصورت زبان سننا چاہتے ہیں
لیکن مری عبادت کسی بھی کھوج کے لیے نہیں ہے
چند سال پہلے میں اس بلندی پر پہنچا تھا
وہاں صرف جنگل تھے، آدمیوں کا قحط تھا
میں اکیلا تھا، اور وہ کسی خوابناک بستی میں خود کو محسوس کرنے گیا تھا
دراصل وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے
اور میں آزاد ہوں
کہ تم یہ سچ مانو: میں نے تمھیں ہرگز دیکھا نہیں

——— تحریک (دہلی)

حمیدہ فاروق

ایک نظم

تیئس برس سے وہ گھر سے باہر نہیں نکلا
سب دروازے بند پڑے ہیں
باہر کا خوف اسے سونے نہیں دیتا
اندر گہری رات چیخ رہی ہے
اور باہر سرخ آندھی .....

ایک پاگل کتا اپنی لمبی، شوکتی جیبھ لٹکائے
شہر کی سڑکوں پر
تیئس برس سے گھوم رہا ہے
اسے ڈھونڈ رہا ہے

(سطور دہلی)

مصحف اقبال توصیفی

خوف

خوف سے میرے لب
آسماں کی طرح نیلے ــــ
آنکھیں پربت کی مانند
بے جان ہیں

یہ کیلنڈر ــــ
اس کو چھپا دو کہیں
اس گھڑی کو کہیں دفن کر دو
یہ ٹک ... ٹک .....

مرے کان میں ریل کی چیخ بننے لگی ہے
میری سانسوں سے کالا دھواں سا
نکلتا ہے ...؛ میں
کہاں جا رہا ہوں

یہ سورج کہ انجن میں دہکے ہوئے
کوئلے ہیں

ستارے
پہیوں کے مانند لڑھکے چلے جا رہے ہیں
کہاں ؟

... وقت .....
ریل کی پٹریوں سے پھسل کر ــــ
نیچے گرنے کو ہے

ــــــ شعر و حکمت (حیدرآباد)

میں زلزلوں کی زمین پر
دم بخود کھڑا اجنبی مسافر
میں کس زمیں پہ قدم جماؤں
میں کس فضا پر نظر لگاؤں
قدم اٹھاؤں کدھر کہ تقدیر میری ہر راہ میں کھڑی ہے
پرانی دانش کہ ڈوبتے پانیوں پہ تختے کی بے یقینی
کسی جزیرے، کسی زمیں کی تلاش میں ہے
مرا ہوا وقت تربتوں میں بٹا ہوا ہے
ادھر وہ ہر لحظہ دور ہوتے حسیں مناظر
مری ندامت کا جسم عریاں
اِدھر یہ قبروں کے سلسلے اپنے پچھلے قدموں پہ ہٹ رہے ہیں
سمٹ رہے ہیں
میں وقت کی گھورتی گرجتی نیا گر اسے قدم قدم نچہ آزما ہوں
ازل سے بوچھار سہہ رہا ہوں
جھکے تو جلتی ہوا کا دامن پکڑ کے اس خاکداں کو چھوڑوں
نہیں بہت ہے

بہت ہے جتنی بھی عمر گزری
فضا میں جاتے ہوئے پرندو!
مجھے اسی گھر میں چھوڑ جاؤ
یہ گھر بھی میرا — زمیں بھی میری
میں زلزلوں کی زمین پر دم بخود کھڑا اجنبی مسافر!
مرے قدم کی حریص مٹی
مرے لہو کو پکارتی ہے
مجھے نکلنے کو مضطرب ہے

——— مورچہ (گیا)

سید جیب

نظامِ زیست

نظامِ زیست کسی تال کا نہیں پابند
جو سنگ بستہ سا ٹھہرا ہوا مقید ہے
ہر آنکھ دیکھ سکے جس کی اتنی بس حد ہے
کرے نہ کچھ بھی جو پیدا دلوں میں حیرانی
نظامِ زیست کسی تال کا نہیں پابند

نظامِ زیست ہے لیکن وہ بے کراں پابند
پہاڑیوں سے جو نکلا ہو بن کے مستانہ
کسی کی آرزوئے وصل کا ہو دیوانہ
یہاں سے دور بہت دور کوہساروں میں
دراز راہوں میں، دشوار رہ گزاروں میں
وہیں، جہاں پہ سلیں برف کی پگھلتی ہیں
جہاں ابلتے ہیں چشمے، ہوائیں چلتی ہیں
وہیں سے تو یہ ندی نالے بہتے آتے ہیں
جو پتھروں کو، چٹانوں کو چیر جاتے ہیں

چٹانیں کاٹ کے جاتے ہیں یہ جدھر جائیں
نکل کے کوہ سے میداں سے یہ گزر جائیں
یہ ہم کنار ہوئے اور بڑھ گیا پانی
ہر ایک سمت کو پھر کھیلتا چلا پانی
یہ جنگلوں میں گزرتا تو گھاٹیوں میں کبھی
یہ پھیلتا کبھی میداں میں وادیوں میں کبھی

ہوئی ہے جس سے بشر کی نظر کو حیرانی
نظامِ زیست ہے گویا وہ بے کراں پانی

——— تحریک (دہلی)

وہاب دانش

وہ لمحہ

طے کر لوں یہ رات کا جنگل
پی لوں تھوڑا
گدلے دریاؤں کا یہ بے رنگ سا پانی
اپنی کھلی ہتھیلی سے میں
چھو لوں ٹھنڈی ریت کی نرمی

سورج کے آنے تک
اپنی ساری آرزوؤں کو
ٹھوس کناروں کی پہچان بتا دوں
شاید تھوڑی دیر کی مہلت
زرد اُجالے میں مل جائے
وقت کے پتھر کے نیچے
اِن دبے ہوئے ہاتھوں کو
وہ لمحہ مل جائے

(سطور دہلی)

عباس اطہر

ہل ٹیڑھا ہے

شیشے کے بدن میں رہتا ہوں
میں آج ہوں میرے آگے پیچھے کل ہیں
پھر بھی تن تنہا ہوں
حاملہ مٹّی کے اوپر سینے کے بل لیٹا ہوں
سر اور پیر تصادم میں ہیں
تاریکی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں
کچّی موت کے بعد جو نہی زندہ ہوتا ہوں
میرے سرہانے نئی نویلی دلہن، دھوپ دہک اٹھتی ہے
سر اور پیر تصادم میں، حقِ زوجیت ماتھے پر
صبح سویرے کلمہ پڑھ کے نہانا،
فصل کے پک جانے تک کھیت کو پانی دیتے جانا
میں نے یہی سنا ہے
حاملہ مٹّی کے اوپر سینے کے بل لیٹا ہوں
بیل ہوں، پتھریلی کھیتی میں
ہانپ گیا ہوں ہل ٹیڑھا ہے
خصّی بیلوں کی سب جوڑیاں

پتھریلے کھیتوں میں ہانپ چکی ہیں
بیج بکھرنے کے آسن بھی بدل چکے ہیں
جانے پیدائش کا لمحہ کب آئے گا
مجبوری کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہا ہوں
پھیکے موسموں اور وقتوں کی
عمر بڑی ہے، ہانپ گیا ہوں

——— شعر و حکمت (حیدرآباد)

کمار پاشی

میں نے سوچا ہے، موجود میرا نہیں

سرپھری آنکھ میرے تعاقب میں ہے اور نیلے درختوں کے جنگل کی سرحد ابھی دور ہے
شہر بھر میں منادی کرادو کہ امشب نہ جاگے کوئی
تاکہ میری شکستوں کا منظر نہ اس بار دیکھے کوئی
میں نے سوچا ہے : موجود میرا نہیں
اب کسی شے پہ دل کو بھروسہ نہیں

اور نیلے درختوں کے جنگل کی سرحد سے پہلے کئی اجنبی شہر ہیں جن سے موجِ ہوا
کے سوا آج تک کوئی گزرا نہیں !

مانجھیو !
آہنی رسّیاں کھول دو
سرپھری آنکھ پھر سے تعاقب میں ہے ، بادباں کھول دو
اور غصیلے جہازوں کو نیلی تہوں میں اتر جانے دو
ہر بلا سے گزر جانے دو
وہ جو موجود ہے اُس کو مر جانے دو

دور جاتے ہوئے ایک موہوم سایے کے اندر مری آتما قید ہے
کوئی منظر مری دسترس میں نہیں
جسم و جاں میرے بس میں نہیں

میں کہ اب ایک مٹتا ہوا لفظ ہوں، اپنے مفہوم سے دور ہٹتا ہوا
خود سے کٹتا ہوا

سر پھری آنکھ میرا تعاقب نہ کر، میں نے دیکھا ہے اک آدمی آج مرتا ہوا
اپنے اندر اُترتا ہوا
میں نے سوچا ہے: موجود میرا نہیں
اور شراپوں کی ماری ہوئی، دور تک رینگتی اس زمیں کا بھروسہ نہیں
اور یہ طے ہے کہ جس کے سبھی منتظر ہیں یہاں، اس کو آنا نہیں
کچھ نہ سوچو ــــ بڑھو!
آہنی رسّیاں کھول دو
سر پھری آنکھ پھر سے تعاقب میں ہے، بادباں کھول دو
مانجھیو!

ــــــــ تحریک (دہلی)

غزلیں

احمد ندیم قاسمی

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا
تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا، صحرا میں بکھر جاؤں گا
تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا
اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا
چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا
تیرا پیمانِ وفا، راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا
اب تو خورشید کو ڈوبے ہوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے میں تا بہ سحر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا، مگر صبح تو کر جاؤں گا

(سطور دہلی)

کام آیا نہ ہوس کا بھی سہارا یارو
سخت تھا مرحلۂ ترکِ تمنّا یارو

بارِ عشرت تو نہیں ہے کہ رفاقت ڈھونڈیں
بارِ غم کا ہے، اٹھاؤ اسے تنہا یارو

آج کے بعد نہ ہو بارِ سماعت شاید
میرا شکوہ کہ جو تھا شکوۂ بیجا یارو

اتنی بھی خوں شُدنِ دل کی شکایت کیوں ہے
تھا یہ منجملۂ آدابِ تمنّا یارو

میں نہیں شاکیٔ بیدادِ زمانہ، کہ میں ہوں
اپنی ہی روشنیٔ طبع کا مارا یارو

——— سطور (دہلی)

خورشید احمد جامی

سورج سروں پہ آگ اگلتا دکھائی دے
مجھ کو یہ شہر آج پگھلتا دکھائی دے

وہ سامنے رکھا ہے کوئی خط کھلا ہوا
وہ دُور کوئی چاند نکلتا دکھائی دے

کس کے قریب جائیے، کس کو پکاریئے
ہر شخص اپنا روپ بدلتا دکھائی دے

میں اس ندی کے پار اُتر جاؤں گا، مگر
آگے کوئی چراغ تو جلتا دکھائی دے

یہ ریگ زارِ غم، یہ خیالوں کی تیز دھوپ
جو زد میں آگیا وہ پگھلتا دکھائی دے

گھر ہو کہ راستہ ہو، اک آسیب ہر جگہ
تنہائیوں کا زہر اُگلتا دکھائی دے

آواز دے کہ رات کے اونچے پہاڑ سے
خوابوں کا پانو آج پھسلتا دکھائی دے

جامی مری نظر میں زمانہ ہے اس طرح
پھولوں کو جیسے کوئی مسلتا دکھائی دے

——— سطور (دہلی)

بپھرائی بپھرائی موجیں، کوسوں دور کنارا سا
اُوپر بادل، نیچے جل تھل، آنکھ تلے اندھیارا سا

پت جھڑ کی کالی راتوں میں آنکھیں چندھیا جاتا ہے
ماضی کی امرائی سے دو لونگوں کا لشکارا سا

پکتے گڑ کی خوشبو پھیل گئی بھوزالی راتوں میں
گاڈو کا رستہ ٹھک ٹھک کرمن کو کرے اشارا سا

اس کو کیا معلوم نہیں تھا جوگی کس کے میت ہوئے
کٹیا میں دو ایک گھڑی کو ہو تو گیا اجیارا سا

پاکیزہ احساس کے ہاتھوں پیاس کی کیسی موت ہوئی
خشک لبوں پر زباں پھیرتا، ڈولے بدن ہتیارا سا

کوئی چمکتی سی شے میرا پیچھا کرتی رہتی ہے
آنکھیں جدھر گھماؤں، گھومے اسی طرف انگارا سا

بیچارے کے پاؤں کبھی دہلیز کبھی دروازے پر
گھوم رہا ہے گھر میں بندھا بندھا ایک بنجارا سا

——— تحریک (دہلی)

چپ کے عالم میں وہ تصویر سی صورت اس کی
بولتی ہے تو بدل جاتی ہے رنگت اس کی

سیڑھیاں چڑھتے اچانک وہ ملی تھی مجھ کو
اس کی آواز میں موجود تھی حیرت اس کی

ہاتھ چھولوں تو لرز جاتی ہے پتّے کی طرح
وہی ناکردہ گناہی پہ ندامت اس کی

کسی ٹھہری ہوئی ساعت کی طرح مہر بہ لب
مجھ سے دیکھی نہیں جاتی یہ اذیت اس کی

آنکھ رکھتے ہو تو اس آنکھ کی تحریر پڑھو
منہ سے اقرار نہ کرنا تو ہے عادت اس کی

خود وہ آغوش کشادہ ہے جزیرے کی طرح
پھیلے دریاؤں کی مانند محبت اس کی

روشنی روح کی آتی ہے مگر چھن چھن کر
سُست رو ابر کا ٹکڑا ہے طبیعت اس کی

ہے ابھی لمس کا احساس مرے ہونٹوں پر
ثبت پھیلی ہوئی بانہوں پہ حرارت اس کی

وہ اگر جا بھی چکی ہے تو نہ آنکھیں کھولو
ابھی محسوس کیئے جاؤ رفاقت اس کی

دل دھڑکتا ہے تو وہ آنکھ بلاتی ہے مجھے
سانس آتی ہے تو ملتی ہے بشارت اس کی

وہ کبھی آنکھ بھی جھپکے تو لرز جاتا ہوں
مجھ کو اس سے بھی زیادہ ہے ضرورت اس کی

وہ کہیں جان نہ لے ریت کا ٹیلا ہوں میں
میرے کاندھوں پہ ہے تعمیر عمارت اس کی

بے طلب جینا بھی شہزاد طلب اس کی ہے
زندہ رہنے کی تمنا بھی شرارت اس کی

شب خون (الہ آباد)

پیاسا ہوں ریگ زار میں دریا دکھائی دے
جو حال پوچھے وہ مسیحا دکھائی دے

ہر تازہ وارد خمِ گیسو کو دیکھ کر
مجھ کو پھر اپنا عہدِ تمنّا دکھائی دے

قربت کی آنچ آئی کہ جلنے لگا بدن
دوری کا درد آج چمکتا دکھائی دے

لہجے کے لوچ میں ہے گناہوں کی دلکشی
آنکھوں میں معبدوں کا سویرا دکھائی دے

ہر زاویے کو جسم کے، اہلِ نظر کی پیاس
ہر خط ترے بدن کا سراپا دکھائی دے

چبھتے ہوئے لباس کا چبھتا ہوا جمال
بُت گر نقابِ سنگ الٹتا دکھائی دے

پڑتی ہے سات رنگوں پہ تیرے بدن کی چھوٹ
جو رنگ تو پہن لے وہ گہرا دکھائی دے

کیا کیا حقیقتوں پہ ہیں پردے پڑے ہوئے
تو ہے کسی کا اور کسی کا دکھائی دے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

خلوت کی انجمن ہے وفاؤں کا سلسلہ
کیا ذکرِ عشق حسن بھی تنہا دکھائی دے

اس آس نے تو اپنا سفینہ ڈبو دیا
طوفاں تھمے تو کوئی جزیرا دکھائی دے

دریا پہ آنسوؤں کے تجھے ڈھونڈتا ہوں میں
پانی پہ تیرا نقشِ کفِ پا دکھائی دے

ہر شخص اپنے آپ تعاقب میں ہے رواں
عالم تمام ایک تماشا دکھائی دے

آؤ کہ دیکھ آئیں فراموشیوں کا شہر
ممکن ہے کوئی اپنا، پرایا دکھائی دے

مخدوم و جامی آہ کہاں کھو کے رہ گئے
ارضِ دکن میں شاذ اکیلا دکھائی دے

——— سطور (دہلی)

حسن نعیم

مری زبان کھلی بھی تو کیا سزا دے گا
بہت ہوا تو مجھے بزم سے اٹھا دے گا

کھڑا ہوا ہوں مثالِ گیاہ طوفاں میں
کوئی درخت نہیں ہوں کہ وہ گرا دے گا

جہاں سے نعرۂ مستاں وہاں سے شہنائی
دبا یہ شور تو نغمہ ہمیں سُلا دے گا

بلا سے راہ کو روکے کھڑا ہے اک مجمع
کوئی تو بھیڑ سے بچنے کا راستا دے گا

کسے یقین رہا ہے کہ حاکمِ دوراں
مری وفا کا مرے دور کو صلہ دے گا

بہت سے باغی و سرکش ہیں قیدیوں میں حسنؔ
کوئی تو جان پہ کھیلے گا، سر کٹا دے گا

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے
کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے
سویرے میری ان آنکھوں نے دیکھا
خدا چاروں طرف بکھرا ہوا ہے
اندھیری رات کا تنہا مسافر
مری پلکوں پہ اب سہما کھڑا ہے
سمیٹو اور سینے میں چھپا لو
یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے
حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کیسا بوڑھا دیوتا ہے
پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے
ہماری شاخ کا نوخیز پتہ
ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے
مجھے اُن نیلی آنکھوں نے بتایا
تمھارا نام پانی پر لکھا ہے

محمد علوی

بھید کچھ کھلتا نہیں دیوار و در میں کون ہے
گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں، میرے گھر میں کون ہے
سب کے سب پاگل نظر آتے ہیں مجھ کو شہر میں
میرے جیسا اور پاگل شہر بھر میں کون ہے
حق بجانب کون ہے اب آپ ہی بتلائیے
میں نہیں بتلاؤں گا میری نظر میں کون ہے
دل کے بلبے میں پڑا ہے اور چلّاتا نہیں
ڈوبتا ہے اور چُپ ہے، چشمِ تر میں کون ہے
کون اپنا گھر اُٹھائے پھر رہا ہے در بدر
گھر میں بیٹھا ہے مگر ہر دم سفر میں کون ہے
سوچتا رہتا ہوں علوی پر سمجھ پاتا نہیں
میں نہیں تو اس بلا کے شور و شر میں کون ہے

——— کتاب (لکھنؤ)

یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی
آ کے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

ایک مدّت سے ہے دل کاسۂ خالی کی طرح
کسی شیشے میں لہو ہو دے تو بھر دے کوئی

ہر جگہ ساتھ رہے گی یہی دیوار کی قید
سر چھپانے کو ہمیں کون سا گھر دے کوئی

جیسے شاداب کیا شاخِ نہالِ غم کو
شجرِ خواب کو بھی برگ و ثمر دے کوئی

میرِ محفل کو گوارا نہیں یہ طرزِ کلام
شمعِ کشتہ کو جو عنوانِ سحر دے کوئی

اب ادا ہو نہ سکے گی مرے سر کی قیمت
سنگِ دشنام دے یا لعل و گہر دے کوئی

صاحبِ فن کو بس اک لمحۂ تخلیق بہت
ورنہ بے سود اگر عمرِ خضر دے کوئی

——— شب خون (الہ آباد)

من موھن تلخ

اب اور سانحے ہم پر نہیں گزرنے کے
گزر گئے ہیں جو لمحے تھے خود سے ڈرنے کے

نہ بھاگنے کے رہے ہم نہ اب ٹھہرنے کے
وہ لمحے آئے جو آکر نہیں گزرنے کے

نئے سرے سے تعلق بنیں گے بگڑیں گے
کہ اب ارادے ہیں ایک ایک بات کرنے کے

یہ ایک عرصے کی چپ کی خراش اور رہی
صدا کے زخم تو چپ سے نہیں تھے بھرنے کے

دلوں میں ہول وہ بیٹھا ہے اڑتی باتوں کا
نہ روکنے کے کسی کو نہ خود ٹھہرنے کے

جو آئے جی میں وہ کہہ لیکن اتنا دھیان رہے
کہ خود پہ ہم نہیں الزام اور دھرنے کے

تو کیا ہوا جو ندی نے بلی نہیں مانگی
فسانے گڑھ نہ لیے سب نے پار اترنے کے

بنا کے تم مری باتیں مرے لیے الزام
نہ بولنے کے رہے ہو نہ چپ ہی کرنے کے

بڑے بڑوں نے جہاں آکے دم نہیں مارا
وہ آئے مرحلے اپنی صدا سے ڈرنے کے

ہم ایسے آئے ہیں جیسے ملیں گے پہلی بار
نئے نئے سے ہیں سب درد بات کرنے کے

یہاں سے جاؤ تو اک اپنے جیسا چھوڑتے جاؤ
عجب رواج ہیں اس شہر سے گزرنے کے

ہر ایک صبح ہے امکانِ سانحہ، ہر شام
صدائیں آتی ہیں یہ دن نہیں تھے مرنے کے

کہو ہر اک سے کہ ہر شخص یاد کھو بیٹھا
بغیر اس کے یہ چہرے نہیں نکھرنے کے

ہر ایک بات اترنے لگی ہے ذہن سے تلخ
بہت قریب ہیں اس لمحے ہم بکھرنے کے

—— آہنگ (گیا)

میں چپ کھڑا تھا، تعلق میں اختصار جو تھا
اسی نے بات بنائی، وہ ہوشیار جو تھا

بٹھا دیا کسی جھونکے نے لا کے منزل پر
ہوا کے دوش پہ کب سے کوئی سوار جو تھا

محبتیں نہ رہیں اس کے دل میں میرے لیے
مگر وہ ملتا تھا ہنس کر کہ وضعدار جو تھا

عجب غرور میں آ کر برس پڑا بادل
کہ پھیلتا ہوا چاروں طرف غبار جو تھا

قدم قدم رمِ پامال سے میں تنگ آ کر
ترے ہی سامنے آیا ترا شکار جو تھا

چھپا کے رکھا تھا اس نے مرے لیے کوئی زہر
وہ میرے ٹوٹتے نشّے کا راز دار جو تھا

——— شعر و حکمت (حیدرآباد)

زبیر رضوی

تھا حرفِ شوق صیدِ ہوا کون لے گیا
میں جس کو سن سکوں وہ صدا کون لے گیا

اک میں ہی جامہ پوش تھا عریانیوں کے بیچ
مجھ سے مری عبا و قبا کون لے گیا

باتوں کا حسن ہے نہ کہیں شوخیٔ بیاں
شہرِ نوا سے حرف و صدا کون لے گیا

میں کب سے ہوں اسیر سرابوں کے جال میں
نیلے سمندروں پہ گھٹا کون لے گیا

میخانہ چھوڑ، گھر کی فضاؤں میں آ گئے
ہم سے متاعِ لغزشِ پا کون لے گیا

میں جب نہ تھا تو مجھ پہ بہت قہقہے لگے
احباب سے سرشتِ وفا کون لے گیا

——— شبِ خون (الہ آباد)

نشتر خانقاہی

کیوں بیاباں بیاباں بھٹکتا پھرا، کیوں پریشاں رہا، غم گزیدہ رہا
آج اک نوجواں مجھ سے کہنے لگا، قیس پاگل تھا، دامن دریدہ رہا

میری راہوں میں گمنام گلیاں بھی تھیں، قصرِ یاراں بھی تھا، شہرِ اغیار بھی
میں کسی آستانے کا پتھر نہ تھا، بوئے گل تھا کہ ہر سو پریدہ رہا

جانے کتنے مسافر یہاں آئے ہیں، ان گنت نام ہیں سقف و محراب پر
اک پرانی عمارت کے سائے تلے میں بہت دیر تک آب دیدہ رہا

اجنبی بن کے راتوں کی تنہائی میں، مجھ سے میرا پتہ پوچھتے ہی رہے
یہ مرے لب جو برسوں مقفّل رہے، یہ مرا سر جو صدیوں خمیدہ رہا

تم کتابوں میں محفوظ کر لو مجھے، کیا عجب ہے کوئی پڑھنے والا ملے
میں وہ آواز ہوں جس کا سامع نہیں، میں وہ لہجہ ہوں جو ناشنیدہ رہا

——— شب خون (الہ آباد)

کوئی پتھر ہی کسی سمت سے آیا ہوتا
پیڑ پھل دار میں اک راہ گزر کا ہوتا

اپنی آواز کے جادو پہ بھروسہ کرتے
مور جو نقش تھا دیوار پہ ناچا ہوتا

ایک ہی پل کو ٹھہرنا تھا منڈیروں پہ تری
شام کی دھوپ ہوں میں کاش یہ جانا ہوتا

پھول کاغذ کے مجھے آپ نے بھیجے کیوں ہیں
ایسا بے حس نہ مجھے آپ نے سمجھا ہوتا

لذتیں قرب کی اے کاش ہمیشہ رہتیں
شاخِ صندل سے کوئی سانپ ہی لپٹا ہوتا

آپ کا قد مرے مصرع سے ذرا سا کم ہے
آپ کس زعم میں ہیں آپ نے دیکھا ہوتا

ایک ہی نقش سے سو عکس نمایاں ہوتے
کچھ سلیقے ہی سے الفاظ کو برتا ہوتا

——— کتاب (لکھنؤ)

وہ روشنی ہے کہ آنکھوں کو کچھ دکھائی نہ دے
سکوت وہ کہ دھماکہ بھی اب سنائی نہ دے
پہنچ گیا ہوں زمان و مکاں کے ملبے تک
مری انا! مجھے الزام نارسائی نہ دے
اگر کہیں ہے تو دل چیر کر دکھا مجھ کو
تو اپنی ذات کا عرفان دے، خدائی نہ دے
ازل کے ٹوٹتے رشتوں کی اس کشاکش میں
پکارا ایسی اداسے، مجھے سنائی نہ دے
میں اب تو بھولنے والا ہوں واقعہ سارا
پرانی بات ہوئی، اب مجھے صفائی نہ دے
مرے زوال کے در پر عروج کی دستک
ذرا قریب سے سن، طنزیہ بدھائی نہ دے
نکل گیا ہوں میں اپنی کمان سے آگے
تعلقاتِ گزشتہ کی اب دہائی نہ دے

——— سطور (دہلی)

ممتاز راشد

ہر چہرے پر خوف کی چادر شعلوں کی بارش گھر گھر
سونی آنکھیں دیکھ رہی ہیں جلتے شہر کا یہ منظر

پتا بھی کھڑکے تو دل سینوں میں خوف سے پھٹ جائیں
کتنی چیخوں کا مدفن ہے سہما ہوا خاموش نگر

چہرے کی تحریر کے پیچھے کیا دکھ ہے یہ بھی سمجھو
میں کوئی اخبار نہیں ہوں تم رکھ دو جس کو پڑھ کر

ہم ہی کچھ نادان تھے جانے کتنے خواب سجا بیٹھے
اُس نے یوں ہی دیکھ لیا تھا چلتے چلتے ایک نظر

جب بھی گزرتا ہے کوئی آوارہ ہواؤں کا جھونکا
تپتی ٹین کی اونچی چھت پر بجنے لگتے ہیں کنکر

پیچھے رہ جانے والوں پر کس منہ سے الزام دھریں
ہم جس کی اگلی صف میں تھے ہار گیا ہے وہ لشکر

کوئی پتھر پھینک کے اس میں اپنا عکس مٹا ڈالیں
جلتی ریت میں کھو جائے گی یہ ندی آگے چل کر

راشد کس امید پہ دل کا آئینہ چمکاتے ہو
جانے کیا تصویر دکھائے دھندلا دھندلا سا منظر

سطور (دہلی)

مصتور سبزواری

گھورتے رستوں کا آسیب بنا ہوں میں تو
مجھ سے مل پاؤ گے کیا شامِ بلا ہوں میں تو

دیوتاؤں سے نہ ہوگا مرا درمانِ زوال
آسمانوں کے سنگھاسن سے گرا ہوں میں تو

جاتے موسم کی طرح اس سے کبھی مل نہ سکا
ایک لمحے کے تعلق کی سزا ہوں میں تو

لوگ گلیوں میں ہی ڈھونڈا کیے آندھی کے سراغ
اپنی آنکھوں کے حصاروں میں بجھا ہوں میں تو

زہر بن کر وہ مصتور مری نس نس میں رہا
میں نے سمجھا تھا اُسے بھول چکا ہوں میں تو

—— شعر و حکمت (حیدرآباد)

سلطان اختر

قدم اٹھاتے ہی چکرا کے گر پڑیں ہم بھی
تمہاری طرح سنبھل کے اگر چلیں ہم بھی

پسینے پونچھ رہی ہے ہوا درختوں کے
تھکن کی گرد کہیں رک کے جھاڑلیں ہم بھی

وہ لکھ رہے ہیں اندھیرے میں کچھ ہتھیلی پر
اجالا ہو تو ذرا غور سے پڑھیں ہم بھی

بدل کے بھیس حریفوں کی فوج نکلی ہے
کسی طرح کا کوئی روپ دھارلیں ہم بھی

ٹھہر گئی ہے کڑی دھوپ ایک مرکز پر
دبیز چھاؤں ملے تو کہیں رکیں ہم بھی

فصیلِ لب پہ جمے ہیں سکوت کے شیشے
زباں کو زخم لگائیں تو کچھ کہیں ہم بھی!

——— موا چہر (گیا)

بے حس ہوا مَن ، سرد بدن ، پران گئے تھک
تج کر تری سنگت ملیں کج بختیاں ، کالک
ذاتوں میں تفاوت تھا ، علاقوں میں جدائی
یوں موہ ، ملن پر نہ بنا تیرا مرا حق
خود وعدے ، وچن جوڑے ۔ نبھائے ۔ پھری ، توڑے
نت سنگ مرے کھیلے ہیں تو نے یہی ناٹک
دوری ہی بچا ۔ اب کے بھی پہلے کی طرح آ
ساون چڑھا ، مدھ مینہاں پڑا ، آم گئے پک
پھر کیا جو بندھا بیاہ کا اک اور سے بندھن
چاہا ہے ازل سے تجھے ، چاہوں گا ابد تک
آباد اُسی ارض پہ ہے اُس کا نگر بھی !
وہ خطّہ وہی ہے جہاں گزرے گرو نانک
سب جگت اگت نرک بنے تجھ سے بچھڑ کر
تو سانسوں کا آنند تھی ، تو آنکھوں کی ٹھنڈک
آخر تجھے اپنانا ہے جُگ بیتیں کہ جیون
سچا ہے مرا کشٹ ، مری سادھنا برحق

—— سطور (دہلی)

کرامت علی کرامت

جو نقوش ابھرے ہیں احساس کے آئینے میں
مٹ کے ضو بار نہ ہوں یاس کے آئینے میں

جس کو اُمید کے پردے پہ بھی دیکھا نہ کبھی
وہی آتا ہے نظر یاس کے آئینے میں

دل کی تسکین کو کافی ہے یہاں موجِ سراب
دیکھیے اس کو ذرا پیاس کے آئینے میں

کیوں گنہ سے نہ منوّر ہو ضمیرِ انساں
کوئلہ چمکے ہے الماس کے آئینے میں

سنگِ امروز سے فردا کو بچاؤں کیسے
بال جب پڑ ہی گئے آس کے آئینے میں

——— سطور (دہلی)

پرکاش فکری

پتھر کی ہتھیلی پہ کوئی پھول اُگا دے
ذرّوں کی تب و تاب سے سورج کو جلا دے
الفاظ کے سینے میں ہمکتے ہوئے خوں سے
کاغذ پہ کسی خواب کی تصویر بنا دے
اُترا ہے پہاڑوں سے غضب ناک اندھیرا
ایسے میں کوئی چیخ کے مجھ کو نہ ڈرا دے
گلیوں میں ہوا رات کو روتی ہے اکیلی
پھیلے ہوئے جنگل کی اُسے راہ بتا دے
ہے دور بہت دور، وہ سرسبز جزیرہ
جائے گا وہاں کون کہ تھکتے ہیں ارادے
ساحل پہ ترے ساتھ تھا فکری تو ہُوا کیا
موجوں میں کبھی ڈوب کے تو اس کو صدا دے

——— آہنگ (گیا)

نازش انصاری

جو رات بھر ترے خوابوں میں گھومتا ہوگا
وہ میں نہیں مری صورت کا دوسرا ہوگا

حقیقتوں کا مجھے تجربہ نہیں، میں چلا
کوئی سراب مری راہ دیکھتا ہوگا

ہماری قبر کا کوئی نشاں نہیں، پھر بھی
ہماری قبر پر اک شخص رو رہا ہوگا

جنوں بنے تو شرارہ، وفا بنے تو گلاب
وہ دل کے بارے میں اتنا تو جانتا ہوگا

تمھارے ہاتھ تمھیں کو ہلاک کر دیں گے
ہمارے بعد تمھارا بھی فیصلہ ہوگا

ہر ایک لمحہ ہے مصروف پھر بھی بے مقصد
ہمارے عہد کا انجام جانے کیا ہوگا

——— تحریک (دہلی)

بس ایک وہم ستاتا ہے بار بار مجھے
دکھائی دیتا ہے پتھر کے آر پار مجھے

مرا خدا ہے تو مجھ میں اتار دے مجھ کو
کہ ایک عمر سے اپنا ہے انتظار مجھے

میں لفظ لفظ بکھرتا رہا فضاؤں میں
مری صدا سے وہ کرتا رہا شکار مجھے

جو ڈھال دیتے ہیں پرچھائیوں کو پتھر میں
اب ایسے سخت دلوں میں نہ کر شمار مجھے

ہوا کچھ ایسی چلی خون کا نشاں نہ ملا
غبارِ راہ کو تکتا ہوں میں، غبار مجھے

حصارِ مرگ میں گھٹ جائے گی صدا تیری
تو دور ہے تو ذرا دیر تک پکار مجھے

——— شعر و حکمت (حیدرآباد)

آزاد گلاٹی

دل کے صحرا پر دیتے ہیں جب اشکوں کے ساگر دستک
روح کے سناٹے میں سنتا ہوں میں اندر باہر دستک

اب تک ہر شب سوتے سوتے چونک اٹھتا ہوں تنہائی میں
مدّت بیتی میں نے سنی تھی اک شب اپنے در پر دستک

شام کا ڈھلتا سورج، دور افق پر ٹھہرا سوچ رہا ہے
کب شب بیتے اور وہ دے پھر صبح کے دروازے پر دستک

بھیگی شب کے سناٹے میں ایسے اس کا دھیان آتا ہے
جیسے کسی تالاب کے پانی پر دیتا ہو کنکر دستک

اب تک ذہن پہ منڈلاتی ہے دکھ سی پیلی، شام سلونی
دل میں آس نراس کی الجھن، میں تنہا، اس کا در، دستک

ابھی تو اُمیدوں نے شیش محل میں رہنے کی سوچی تھی
ابھی سے کیوں دیتے ہیں در پر محرومی کے پتھر دستک

تن کا خالی برتن، چھن سے بج اٹھا۔ آزاد! جب اس نے
اس پر اک شب دیدی پہن کر اک خواہش کی جھانجھر دستک

——— تحریک (دہلی)

غزل غزل میں ستائش ترے جمال کی ہے
یہ دلکشی تری آنکھوں میں کس غزال کی ہے

اُتار دی ہے ہر اک پیڑ نے قبا اپنی
خزاں کی رُت میں ادا موسمِ وصال کی ہے

ہے دل کی ڈور میں بیتے ہوئے دنوں کا حساب
کہ ایک ایک گرہ ایک ایک سال کی ہے

مہک اٹھی وہ جگہ دو گھڑی جہاں بیٹھے
کہ سانس سانس میں خوشبو ترے خیال کی ہے

کبھی نہ اس سے کبھی دل کی بات اس ڈر سے
ہر ایک بات پہ عادت اسے سوال کی ہے

خلا سے لوٹ کے آؤں گا پھر زمیں کی طرف
مرا عروج علامت مرے زوال کی ہے

——— آہنگ (گیا)

عروج زیدی

کسے بتاؤں کہ غم کیا ہے سرخوشی کیا ہے
ابھی زمانے کا معیارِ آگہی کیا ہے

قدم قدم پہ میں سنبھلا ہوں ٹھوکریں کھا کر
یہ ٹھوکروں نے بتایا غلط روی کیا ہے

زمیں پہ لالہ و گل، آسماں پہ ماہ و نجوم
نگاہِ حسن طلب کے لیے کمی کیا ہے

نظر نظر میں پیام و سلام کا عالم
کوئی سمجھ نہ سکا امرِ واقعی کیا ہے

پرائے نقشِ قدم پر قدم قدم چل کر
بتا رہے ہیں مجھے وہ کہ رہبری کیا ہے

نفس کی آمد و شد پر بھی اختیار نہیں
یہ زندگی ہے تو مقصودِ زندگی کیا ہے

وفا پرستوں سے کیوں ضد ہے؟ اس تعجب میں
سوال یہ ہے کہ اس کا جواب ہی کیا ہے

یہی قدم تھے محیطِ بساطِ کون و مکاں
قدم اٹھاؤں تو پھر دیکھنا ابھی کیا ہے

عروج تیرگیِ شب کا احترام کرو
اسی سے تم نے یہ جانا کہ روشنی کیا ہے

—— تحریک (دہلی)

حیا اخفائے رازِ دل کی اک تدبیر ہوتی ہے
نظر جھکتی ہے وہ جس میں کوئی تحریر ہوتی ہے
رواجاً زحمتِ اظہار دی جاتی ہے ہونٹوں کو
محبت میں خموشی ورنہ خود تقریر ہوتی ہے
ہر اک دیوانہ پابندِ وفا رہتا ہے آخر تک
جنوں کے پانو میں بھی ہوش کی زنجیر ہوتی ہے
سبھی کرتے ہیں دعویٰ صاحبِ ایمان ہونے کا
مگر ہر دل کے آئینے میں اک تصویر ہوتی ہے
جہاں برقِ تپاں کی یورشِ پیہم کا امکاں ہو
عموماً آشیانے کی وہیں تعمیر ہوتی ہے
نہ جانے کون سے خوش بخت کا یہ قول ہے ارشد
کہ آہِ صبح گاہی میں بڑی تاثیر ہوتی ہے

——— تحریک (دہلی)

بات بڑھتی گئی آگے مری نادانی سے
کتنا ارزاں ہوا میں اپنی فراوانی سے

ایسا ناپید ہوا میں سرِ منظر کہ نہ پوچھ
گرد بھی میری نہ پائی گئی آسانی سے

بے تحاشہ جیے ہم لوگ، ہمیں ہوش نہیں
وقت آرام سے گزرا کہ پریشانی سے

مجھ کو محسوس نہ ہوتا جو میں پتھر ہوتا
آئنے دیکھا ہی کرتے مجھے حیرانی سے

اب مرے گرد ٹھہرتا ہی نہیں کوئی حصار
بندشیں ہار گئیں بے سر و سامانی سے

خاک ہی خاک نظر آئی مجھے چاروں طرف
جل گئے چاند ستارے مری تابانی سے

——— سطور (دہلی)

میں روز ایک نئی داستاں بناؤں گا
پھر اُس کے بعد خموشی میں ڈوب جاؤں گا

سکوں ملے مجھے مٹّی کی کوکھ میں شاید
میں مر گیا تو کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا

وہ ڈور ہے تو مرے ہاتھ میں رہے گی صدا
پتنگ ہے تو ہوا میں اُسے اڑاؤں گا

جُدا جُدا ہیں لکیریں سبھی کے ہاتھوں کی
ہجوم میں بھی اکیلا ہی خود کو پاؤں گا

اگر نصیب ہوئی مجھ کو ایک بھی نیکی
میں اپنے سارے گناہوں کو بھول جاؤں گا

—— ہماری زبان (علی گڑھ)

چندر پرکاش شاد

دل سے اک آگ کی دیوار ابھرتی جائے
زینہ زینہ شبِ تنہائی اُترتی جائے
تم سے ملنے کا جو برسوں میں کبھی آئے خیال
ہر طرف فاصلوں کی ریت بکھرتی جائے
وقت کی چال کو ہم روکے رہیں کمرے میں
اور اُدھر رات اندھا دُھند گزرتی جائے
تپتا صحرا ہے ہر اک شہر، اور اُمیدِ سکوں
ایک بدلی ہے جو اُوپر سے گزرتی جائے
میں تو اوقات کے پھیلاؤ میں بڑھتا جاؤں
اور جو اک شے مرے اندر ہے وہ مرتی جائے
جانے کیا بھوت چھپے بیٹھے ہیں اُس آنگن میں
رات جائے تو وہاں کانپتی ڈرتی جائے
ذہ نظر پھول کھلاتی چلے پہلو پہلو
بن کے کانٹا سا دلوں میں بھی اترتی جائے

——— تحریک (دہلی)

عجیب شخص ہے مجھ کو تو وہ دِوانہ لگے
پکارتا ہوں تو اُس کو مری صدا نہ لگے
گزر رہا ہے مرے سر سے جو ہوا کی طرح
کبھی کبھی تو وہی لمحہ اِک زمانہ لگے
گلی میں جس پہ ہر اک سمت سے چلے پتھر
مجھے وہ شخص کسی طرح بھی بُرا نہ لگے
مزاج اس نے بھی کیسا عجیب پایا ہے
ہزار چھیڑ کروں پر اُسے بُرا نہ لگے
اِسی خیال سے شاید ہے بند وہ کھڑکی
ٹھٹھرتی شام کی اس کو کہیں ہوا نہ لگے
سنائیں کس کو یہاں آپ بیتی ہم اسلم
ہمیں تو اپنی ہی ہر بات خود فسانہ لگے

——— شب خون (الہ آباد)

احتشام اختر

ورق ورق یہ فسانہ بکھرنے والا تھا
بچا لیا مجھے اس نے میں مرنے والا تھا

شگفتہ پھول پریشاں ہُوا تو غم نہ کرو
کہ وہ تو یوں بھی ہوا میں بکھرنے والا تھا

میں اس کو دیکھ کے پھر کچھ نہ دیکھ پاؤں گا
یہ حادثہ بھی مجھی پر گزرنے والا تھا

صدائے سنگ نے مجھ کو بچا لیا ورنہ
میں اس پہاڑ سے ٹکرا کے مرنے والا تھا

میں بے قصور ہوں یہ فیصلہ ہُوا ورنہ
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

پہاڑ سینہ سپر ہو گیا تھا میرے لیے
وگرنہ مجھ میں سمندر اترنے والا تھا

——— مورچہ (گیا)

دھڑکتے دل کو پتھروں میں ڈھونڈنا تو چاہیئے
کہیں خدا ملے، ہمیں کوئی خدا تو چاہیئے

نہیں کہ اپنے دوستوں سے کچھ اُمید ہو مجھے
مگر کسی کو میرا حال پوچھنا تو چاہیئے

کسی سے رسم نامہ و پیام بند ہی سہی
مگر کبھی کبھی صبا کو ٹوکنا تو چاہیئے

کسی کو جیسے اب کسی کا انتظار ہی نہیں
کنارِ رہگذر کہیں کوئی دیا تو چاہیئے

کبھی تو میں بھی لطف و کیفِ گفتگو اٹھا سکوں
کبھی خموش بام و در کو بولنا تو چاہیئے

کہو تو اُٹھ کے کھڑکیوں کے اُودے پردے کھول دوں
اس آسمان پر کہیں کوئی گھٹا تو چاہیئے

ذرا رکو، کوئی بگولہ اُٹھ کے رقص تو کرے
ہم اہلِ دشت کے لیے بھی رہنما تو چاہیئے

نہ جانے زیب میکدے سے جلد کیوں چلا گیا
کٹے گی کیسے رات کوئی آشنا تو چاہیئے

آہنگ (رگیا)

عقیل شاداب

نہ زندگی سے شکایت نہ تم سے شکوہ ہے
مرا لباس ہی میرے لہو کا پیاسا ہے
بدن کو چھوڑ کے جاؤں تو اب کہاں جاؤں
جنم جنم سے مرا اس کے ساتھ رشتا ہے
مرا وجود مری اپنی ہی نگاہوں میں!
لباسِ جسم کے ہوتے ہوئے بھی ننگا ہے
صلیب لاؤ! اسے سرخرو کیا جائے
کوئی کتاب لیے آسماں سے اترا ہے
تمھارے جسم میں میں ہوں مرے وجود میں تم
ہر ایک آدمی اک دوسرے میں زندہ ہے
تم اپنے آپ سے کیوں اجنبی سے لگتے ہو
تمھارے جسم پہ شاداب کس کا پہرہ ہے

——— تحریک (دہلی)

حسن کمال

شاید جو زہر شہر میں تھا کام کر گیا
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا

پاگل کوئی اِک اِک سے یہی پوچھتا تھا کل
ہم سب کا ایک گھر تھا بتاؤ کدھر گیا

سورج کو جنم دے کے جھلسنے کے واسطے
ٹھنڈی سی ریت چھوڑ سمندر اُتر گیا

سوچا تھا اپنے دل میں سنواروں گا میں تمھیں
تم آئے تم کو دیکھ کے میں خود بکھر گیا

جب تک میں زندگی کو نہ سمجھا تھا جی لیا
جب آگئی سمجھ میں، تو بے موت مر گیا

ہر شام کتنے درد سے دیکھا ہے یہ حسن
سورج کا خون پی کے سمندر نکھر گیا

——— شاعر (بمبئی)

عبدالرحیم نشتر

پھول سا جسم نہ رستے میں جلایا کیجے
میں صنوبر ہوں مری چھاؤں میں آیا کیجے

اور کیا چاہیے اس دور کے انسانوں کو
صرف دو چار گھڑی ساتھ بتایا کیجے

آپ ساگر ہیں تو سیراب کریں پیاسے کو
آپ بادل ہیں تو مجھ دشت پہ سایا کیجے

آپ سے نور کی خیرات طلب کرتے ہیں
بن کے خورشید نہ پھولوں کو جلایا کیجے

کم سے کم دیکھ سکوں اپنی حقیقت کیا ہے
میری آنکھوں سے نہ آئینہ چھپایا کیجے

——— آج کل (دہلی)

ہر مرحلے سے یوں تو گزر جائے گی یہ شام
لے کر بلائے درد کدھر جائے گی یہ خام

پھیلیں گی چار سمت سنہری اُداسیاں
ٹکرا کے کوہِ شب سے بکھر جائے گی یہ شام

رگ رگ میں پھیل جائے گا تنہائیوں کا زہر
چپکے سے میرے دل میں اتر جائے گی یہ شام

خونی نہیں ہیں مملکتِ شب کی سرحدیں
ہاتھوں میں لے کے کاسۂ سر جائے گی یہ شام

ٹھہرے گی اک لمحے کو یہ گردشِ حیات
تھم جائے گی یہ صبح، ٹھہر جائے گی یہ شام

مہکے گا لفظ و معنی سے شاہد دیارِ صبح
لے کر مری غزل کا اثر جائے گی یہ شام

——— شاعر (بمبئی)

احمد وصی

خود کو چھونے سے ڈرا کرتے ہیں
ہم، جو نیندوں میں چلا کرتے ہیں
اپنی ہی ذات کے صحرا میں آج
لوگ چپ چاپ جلا کرتے ہیں
خون شریانوں میں لہراتا ہے
خواب آنکھوں میں ہنسا کرتے ہیں
ہم جہاں بستے ہیں، اس بستی میں
اب فقط سایے ملا کرتے ہیں
آتی جاتی ہیں بہت سی یادیں!
دائرے بن کے مٹا کرتے ہیں

——— شب خون (الہ آباد)